مَلاکُ التأوِیل

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سورة البقرة

(۲۳) آیت ۱۲۰:

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾

''اور اگر تم ان کی خواہشات کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ تمہارے پاس علم پہنچ گیا ہے' تو پھر تم اللہ کی طرف سے نہ کوئی دوست پاؤ گے اور نہ کوئی مددگار۔''

اور آیت ۱۴۵ میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾﴾

''اور اگر تم ان لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی' ہر ایک نشانی بھی لے کر آؤ تو وہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے' اور نہ ہی تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہو' اور نہ ہی اُن کے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور اگر تم ان کی خواہشات کی پیروی کرو گے' بعد اس کے کہ علم تمہارے پاس آ چکا ہے' تو پھر تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

اور سورۃ الرعد کی آیت ۳۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾﴾

''اور اسی طرح ہم نے اسے ایک فرمان عربی کی حیثیت سے نازل کیا ہے۔ اور اگر تم ان کی خواہشات کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ جو علم تمہارے پاس آ چکا ہے' تو تمہارے لیے اللہ کی طرف سے نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ ہی کوئی بچانے والا۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کرسکتا ہے کہ اگر چہ ان تینوں آیات کا آغاز ایک جیسا ہے اور معنی بھی مماثلت رکھتا ہے تو پھر ان کے اختتام میں فرق کیوں واقع ہوا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ سورۃ الرعد کی مذکورہ آیت سے قبل اہلِ کتاب کے کفر اور مخالفت پر اصرار کا ویسا ذکر نہیں ہوا ہے جو کہ سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

دیکھئے' سورۃ الرعد میں اس آیت سے قبل اہل کتاب کی مدح میں پہلے یہ الفاظ ذکر کیے گئے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ (آیت ۳۶)

''اور جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اس (وحی) سے جو آپؐ پر اتاری گئی''

اور ان سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان جیسے مؤمن ہیں۔ اور پھر کہا:

﴿وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ﴾

''اور پھر گروہوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہیں۔''

گویا ان کا حال بیان تو ہوا لیکن انتہائی اختصار کے ساتھ' اور اسی لیے جب ان کی پیروی سے ڈرایا گیا تو بھی اختصار سے کام لیا گیا اور صرف یہ کہا گیا:

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾﴾

دیکھئے یہاں پر ''الَّذِی'' کے مقابلے میں صرف ''مَا'' لایا گیا ہے جس میں اختصار پایا جاتا ہے' اِلا یہ کہ اس کے ساتھ معنی میں وسعت پیدا کرنے کے لیے کچھ اور ذکر کیا گیا ہو' جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

اور پھر یہاں ''وَلَا نَصِيْرٍ'' کے مقابلے میں صرف ''وَلَا وَاقٍ'' کہا گیا' جو لفظ اور معنی دونوں اعتبار سے اختصار رکھتا ہے (یعنی لفظی اعتبار سے ''نَصِیر'' چار حرفی اور ''وَاقٍ'' تین حرفی لفظ ہے اور معنی کے اعتبار سے نَصِیر بمعنی مددگار' وَاقٍ بمعنی بچانے والے سے زیادہ وسعت رکھتا ہے) اور اسی لحاظ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے ٹھیک جگہ پر آئی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت ۱۲۰ سے قبل اہل کتاب کی قبیح حرکات کا تفصیلی ذکر ہے' پہلے فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾

''اور جو لوگ علم نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ ان کے دل آپس میں ایک جیسے ہیں۔ ہم نے یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں۔''

اس کے بعد اہلِ کتاب کے دونوں گروہوں کی حقیقت حال کو بیان کیا کہ وہ ایمان سے کیسے دور بھاگتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ﴾

''اور یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی نہ کر لیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔''

اور پھر اس مفصل بیان کے بعد فرمایا:

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾

''اور اگر آپ نے علم کے آ جانے کے باوجود بھی ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے ہاں نہ آپ کے لیے کوئی دوست ہوگا اور نہ مددگار۔''

یہاں تفصیلی بیان کے بعد اس آیت میں بھی تفصیل اختیار کی گئی ہے۔ سورۃ الرعد میں اختصار تھا تو لفظ ''مَا'' (دو حرفی لفظ) کہہ کر اختصار سے کام لیا گیا بمقابلہ آیت سورۃ البقرۃ کے جس میں لفظ ''الَّذی'' (پنج حرفی لفظ) لایا گیا کہ وہاں طوالت مقصود تھی' یہاں آخر میں ''نَصِیْرٍ'' ہے اور سورۃ الرعد میں ''وَاقٍ'' ہے۔ ''نَصِیْر''، فعیل کے وزن پر ہونے کی وجہ سے اپنے مفہوم میں وسعت رکھتا ہے کہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس میں کثرت پائی جاتی ہے بمقابلہ ''فاعل'' کے صیغے کے۔ ''وَاقٍ'' فاعل کا صیغہ ہے جس میں یہ وسعت نہیں پائی جاتی۔

اس طرح دونوں آیات کا اختتام اپنی اپنی جگہ انتہائی مناسب پایا گیا' جہاں تفصیل تھی وہاں کلام میں طوالت پائی گئی اور جہاں اختصار تھا وہاں ایجاز سے کام لیا گیا۔

اب آیئے سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت (آیت نمبر ۱۴۵) کی طرف۔ یہاں اس سے قبل اہل کتاب کی چند مزید غلطیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے' اس لیے اس آیت میں بھی وہ الفاظ لائے گئے جس میں ایجاز نہیں بلکہ طوالت ہے۔ یہاں پہلے ''مِنْ'' کا ذکر ہے جو غایت کے لیے یا ابتداءِ غایت کے لیے ہے (تمہارے پاس علم کے آ جانے کے بعد اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی)۔ پھر ''مَا'' کا لفظ لایا گیا جو ''الَّذی'' کی جگہ لے رہا ہے اور خیال رہے کہ ''مَا'' جب ''مِن'' کے بعد آئے تو سیاق وسباق کا تقاضا ہے کہ اسے موصول مانا جائے (بمعنی الَّذِی) یا موصوف مانا جائے' دونوں صورتوں میں وہ پورے مضمون کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾﴾ (تب آپ یقیناً ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔)

اس اسلوبِ بیان میں دوست' مددگار اور بچانے والے یعنی تینوں الفاظ سے زیادہ زور ہے' یعنی ظالم ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کا نہ کوئی دوست ہو اور نہ ہی مددگار۔ جیسے اس کی وضاحت ''سورۃ الشوریٰ'' میں آ گئی۔ فرمایا: ﴿وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۸﴾﴾ ''اور ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ مددگار''۔ یعنی ظلم کے وصف کے ساتھ دوست اور مددگار ہونے کی نفی بھی ہوگئی' جبکہ اگر صرف دوست یا مددگار کی نفی ہو تو اس سے خاص طور پر ظلم کی نفی لازم نہیں ہوتی' اور اس طرح یہ آیت دوسری دونوں آیات کے مقابلے میں زیادہ وزن رکھتی ہے اور اسی وجہ سے اس سے پہلے تفصیل سے اہلِ کتاب کے جرائم کا ذکر ہوا۔ یہاں یہ زوردار الفاظ اس لیے بھی استعمال ہوئے کہ اس سے قبل اللہ کے رسول ﷺ کی یہ شان بیان ہو رہی تھی کہ وہ کسی صورت ان کی پیروی کرنے والے نہ ہوں گے (وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ)

اس تفصیل سے تینوں آیات کے محل اور موقع کا بیان ہو گیا۔

اور اگر یہ مان لیا جائے کہ سورۃ الرعد کی آیت مکی ہے تو پھر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جوں جوں آپ کا علم

بڑھتا گیا' کلام میں شدت آتی گئی۔

سورۃ الرعد ابتدائی حالت سے متعلق تھی تو وہاں ایجاز سے کام لیا گیا۔سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت (نمبر ۱۱۸) مزید علم آ جانے کی بنا پر طوالتِ کلام کا باعث ہوئی۔اور پھر دوسری آیت (نمبر ۱۴۵) کے نازل ہونے تک مزید علم آ چکا تھا تو اس میں زورِ بیان اور زیادہ ہو گیا۔

بہرحال ہم نے اپنی سی حد تک دونوں توجیہات پیش کر دی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو بخوبی جانتے ہیں۔

(۲۴) آیت ۱۲۵:

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾

''اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔''

سورۃ الحج کی آیت ۲۶ میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِىْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۲۶﴾﴾

''اور جب ہم نے ابراہیم کے لیے کعبہ کی جگہ مقرر کر دی اس شرط پر کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف' قیام اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا۔''

یہاں سوال کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ سورۃ البقرۃ میں ''وَالْعٰكِفِيْنَ'' (اعتکاف کرنے والوں) کا اور سورۃ الحج میں ''وَالْقَآئِمِيْنَ'' (قیام کرنے والوں) کا ذکر کیا' حالانکہ دونوں جگہ بیت اللہ کو پاک صاف رکھنے کا حکم ایک ہی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ ''قائمین'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک خاص ہیئت میں کہیں اقامت اختیار کرتے ہیں اور پھر اسی حالت پر جمے رہتے ہیں اور اس معنی میں قائمین اور عاکفین کا ایک ہی مطلب ہو جاتا ہے' گو الْعَاكِفِيْن میں اسی خصوصی حالت کا واضح طور پر تذکرہ ہے۔چونکہ سورۃ الحج سے پہلے سورۃ البقرۃ میں ''العاکفین'' آ چکا تھا اس لیے سورۃ الحج میں القائمین کہہ کر اعتکاف کی طرف بھی اشارہ ہو گیا' اور تکرار سے بچا گیا' کیونکہ عربی اسلوب کے مطابق تکرار وہاں کی جاتی ہے جہاں یا تو کسی چیز کی بڑائی یا اس کی ہولناکی مقصود ہو' جیسے: الحاقة' ما الحاقّة (واقع ہونے والی! اور واقع ہونے والی کیا ہے!) اور اس جیسی دوسری آیات۔

چونکہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں نہ پہلے اور نہ بعد ''اعتکاف'' کا ذکر تھا تو اس کا خاص طور پر ذکر کرنا بہتر تھا اور سورۃ الحج میں جب ''القائمین'' کہا گیا تو گویا سورۃ البقرۃ کی آیت کی طرف اشارہ ہو گیا کہ اس سے مراد ''اعتکاف کرنے والے'' ہیں۔سورۃ البقرۃ میں ''قائمین'' کے ذکر کی ضرورت نہ تھی کہ ''عاکفین'' سے مراد وہی لوگ ہیں جو کسی خاص ہیئت پر اقامت اختیار کرتے ہوں۔اور یوں دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ پر پوری مناسبت کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔

اور ''اَلرُّكَّعِ السُّجُوْدِ'' سے مراد ہے نماز پڑھنے والے۔یعنی اعتکاف کرنے والوں اور نماز ادا کرنے

والوں‘ سب کا ذکر آ گیا۔

جو لوگ ’’قائمون‘‘ سے بھی نمازی مراد لیتے ہیں تو اس کی توجیہہ یہ ہوگی کہ سورۃ البقرۃ میں چونکہ اعتکاف کرنے والوں کا خصوصی ذکر ہو گیا تھا تو یہاں نماز کی تینوں ہیئتوں (قیام‘ رکوع‘ سجود) کی طرف اشارہ کر کے نماز کی اہمیت کی طرف اشارہ ہو گیا۔ واللہ اعلم!

(۲۵) آیت ۱۲۶:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾

’’اور جب ابراہیم نے کہا: اے ربّ! اسے ایک پُرامن شہر بنا دے۔‘‘

اور سورۃ ابراہیم کی آیت ۳۵ میں ’’البلد‘‘ کو معرفہ ذکر کیا۔ فرمایا:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾

’’اے رب! اس شہر کو ایک پرامن شہر بنا دے۔‘‘

سوال یہ ہے کہ یہ اختلاف کیوں ہے‘ ایک جگہ ’’بلد‘‘ نکرہ ہے اور دوسری جگہ ’’البلد‘‘ معرفہ ہے؟ جواباً عرض ہے‘ اور اللہ بہتر جانتے ہیں کہ سورۃ البقرۃ کی آیت سے پہلے دو جگہ بیت اللہ کا ذکر ہے‘ فرمایا:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ﴾ (آیت ۱۲۵)

’’اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز اجتماع اور پُرامن بنایا۔‘‘

پھر فرمایا:

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ ..... ﴾

’’اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے عہد لیا کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں.....‘‘

اور اس سے قبل ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بچے کو اس غیر آباد جگہ لا کر یہ دعا کر چکے تھے:

﴿رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ (ابراھیم:۳۷)

’’اے میرے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد تیرے حرمت والے گھر کے نزدیک ایک بے کھیتی کی وادی میں لا بسائی ہے۔‘‘

اور اس طرح ’’بیت‘‘ کا بحیثیت معرفہ ذکر کرنے میں بلد حرام کا بھی بحیثیت معرفہ ذکر ہو گیا‘ اس لیے ’’هٰذَا‘‘ کے ساتھ مشارٌ اِلیہ لانے کی ضرورت نہ رہی‘ بلکہ بیت اللہ کے ذکر کے بعد صرف اس جگہ کی طرف ’’هٰذَا‘‘ کہہ کر اشارہ کر دیا اور اس کے بعد ’’بلدًا‘‘ کو بحیثیت مفعول ثانی لائے اور ’’آمِنًا‘‘ اس کی صفت ٹھہری۔

’’هٰذَا‘‘ یہاں مفعول اول کے مقام پر ہے کہ یہاں بیت اللہ کے ذکر کی بنا پر صرف اشارہ ہی کافی تھا اور اگر ’’بلد‘‘ کو الف لام کے ساتھ معرفہ بھی لایا جاتا تو اس سے کوئی زائد معنی حاصل نہ ہوتا بلکہ تکرار کی شکل ہو جاتی‘ اس لیے کلام میں ایجاز رکھا گیا‘ لیکن اس ایجاز میں جو بلاغت ہے وہ اہلِ نظر پر مخفی نہیں ہے۔

سورۂ ابراہیم کی آیت سے قبل ایسے کوئی اشارات نہیں ہیں جو سورۃ البقرۃ میں تھے۔ اس لیے عربی اسلوب کے مطابق مشار اِلیہ کو الف لام کے ساتھ لانا (اور خاص طور پر جب وہ اسم جامد ہو) ضروری تھا۔ یہاں هٰذَا

الْبَلَدَ مفعول اوّل اور ''آمِنًا'' مفعول ثانی قرار پائے گا۔

ایک دوسری توجیہہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ چونکہ ابھی بَلَد (شہر) آباد نہیں ہوا تھا' اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ کی طرف ''ھٰذَا'' کہہ کر اشارہ کیا۔ یعنی یوں کہا: اے اللہ! اس جگہ کو ایک پُرامن شہر میں بدل دے! اور سورۂ ابراہیم میں ''البلد'' کہا گیا چونکہ شہر آباد ہو چکا تھا۔ گویا یہ کہا: ''اے اللہ! اس آباد شہر کو امن کا گہوارہ بنادے!''

(۲۶) آیت ۱۲۹:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ﴾

''اے ہمارے رب! ان کی طرف ان میں سے ایک رسول کو بھیج جو ان پر تیری آیات پڑھے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔''

سورۂ آل عمران' آیت ۱۶۴ میں ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ﴾

''اور اللہ نے مؤمنوں پر احسان کیا کہ ان میں' انہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے' اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

اور سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ﴾

''وہی ہے جس نے امیین میں' انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے' اور ان کا تزکیہ کرتا ہے' اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

یہاں پہلی آیت میں ''يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' پہلے آیا ہے اور پھر ''يُزَكِّيْهِمْ'' اور باقی دونوں آیات میں اس کے برعکس ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ جواباً عرض ہے' واللہ اعلم' کہ پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وقت کی دعا کا ذکر ہے جب کہ وہ امت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی جن میں رسول بھیجے جانے کی دعا کی جارہی ہے۔ ان کا تزکیہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جبکہ پہلے انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دی جائے اور ان پر آیات کی تلاوت ہو' کیونکہ گمراہی سے بچنے اور تزکیہ کے حصول کے لیے تعلیم وتربیت کا پہلے ہونا ضروری ہے۔

دیکھئے تزکیہ کو نیک اعمال کے ساتھ مرتبط کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ (التوبۃ:۱۰۳)

''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجیے جس کے ذریعہ آپ ان کی تطہیر کریں اور انہیں پاک صاف کریں۔''

صاف ظاہر ہے کہ اس نیک عمل (یعنی صدقہ دینے) کے نتیجہ میں ان کا تزکیہ ہوگا۔ اس لیے تزکیہ کا ذکر اس سبب کے بعد کیا گیا جس کی وجہ سے تزکیہ حاصل ہو رہا ہے۔ گویا یہاں ترتیب یوں ہے کہ پہلے مسبب کا بیان ہوا اور اس کے بعد سبب کا۔

جہاں تک باقی دو آیات کا تعلق ہے تو وہاں یہ احسان جتلانا مقصود ہے کہ گمراہی کے بعد انہیں ہدایت سے نوازا گیا اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا پوری ہونے کا احساس دلایا گیا۔ اس لیے کتاب وحکمت' جن کی وجہ سے گمراہی زائل ہوئی اور ہدایت نصیب ہوئی' ان کا ذکر مؤخر کیا گیا۔ اور چونکہ یہاں احسان جتلانا مقصود ہے اس لیے پہلے ان کے تزکیہ (پاک وصاف ہونے) کا ذکر کیا' یعنی یہ لوگ گمراہ تھے' اللہ نے انہیں اپنے نبی کے ذریعہ وہ کچھ سکھلایا کہ جس سے ان کی گمراہی دور ہوگئی۔

یہاں مُسبَّب (نتیجے) کا ذکر پہلے کیا گیا اور سبب (تعلیم کتاب وحکمت) کا ذکر بعد میں کیا گیا۔ یعنی تقدیم و تاخیر' دونوں طرح کی آیات میں' جو قصد تھا' اس کے اعتبار سے کیا گیا۔ واللہ اعلم!

(۲۷) آیت ۱۳۴:

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾

''یہ امت گزر چکی' اور اس کے لیے وہ کچھ ہے جو اس نے کمایا اور تمہارے لیے ہے جو کچھ تم نے کمایا' اور تم سے یہ سوال نہ ہوگا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے۔''

اور پھر آیت ۱۴۱' اسی آیت کا اعادہ ہے تو اس تکرار کا مقصد کیا ہے؟ اس کی وجہ ہو سکتی ہے' واللہ اعلم' کہ لوگوں نے جب ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام' ان کے پیروکاروں اور ان میں آنے والے انبیاء کی بزرگی اور نیکی کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ ان سے نسبت حاصل ہونے کی بنا پر انہیں بھی نفع حاصل ہوگا تو انہیں یاد دلایا گیا کہ تمہیں صرف تمہارے اپنے اعمال نفع پہنچائیں گے' اور اپنے اسلاف کے اچھے اعمال کی پیروی کیے بغیر ان سے صرف نسبت رکھنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس لیے فرمایا:

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ .....﴾ (الآیۃ)

اور پھر انہیں یاد دلایا گیا کہ وہ اپنے اسلاف کے بارے میں کیا کیا اعتقاد رکھتے تھے۔ پھر یہ بھی یاد دلایا گیا کہ تم ان کے بارے میں یہ یہ غلط اعتقاد بھی رکھتے تھے اور کہا گیا کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور یہ بھی کہ سچی شہادت کو چھپانا کتنا بڑا ظلم ہے' اور اس کے بعد یہ آیت لائی گئی:

﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ .....﴾ (الآیۃ)

گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جو جو جرائم (کتمانِ حق اور کتمانِ شہادت) تم نے کیے ہیں' تم ان کے بارے میں جوابدہ ہوگے' کسی دوسرے پر اس کا وبال نہ ہوگا۔

دونوں آیتوں میں اپنے اسلاف کی طرف نسبت رکھنے کا خیال مشترک ہے لیکن مقصود مختلف ہے۔ یعنی پہلی دفعہ ان کے نیک اعمال سے انہیں نفع حاصل کرنے کی نفی کی گئی ہے اور دوسری مرتبہ انہیں اپنے جرائم کی جوابدہی

کرنے کا احساس دلایا گیا ہے۔ مزید وضاحت آگے بھی آئے گی۔

(۲۸) آیت ۱۳۶:

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾

''کہہ دو! کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اتارا گیا ہے ہم پر اور ابراہیم' اسمٰعیل' اسحٰق' یعقوب اور ان کی اولاد پر' اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو کچھ انبیاء کو دیا گیا ان کے رب کی طرف سے۔''

اور سورۂ آل عمران کی آیت ۸۴ میں یہ آیت اس طرح نازل ہوئی:

﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠﴾

یہاں تین سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) پہلی آیت میں ''قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ'' اور دوسری آیت میں ''قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ''۔

(۲) پہلی آیت میں ''وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا'' اور دوبارہ ''اِلٰى'' کا صلہ استعمال ہوا' اور دوسری آیت میں ''وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا'' اور دوبارہ ''عَلٰى'' کا صلہ استعمال ہوا۔

(۳) پہلی آیت میں ''وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ'' کہا گیا' جبکہ دوسری آیت میں صرف ''وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ'' کہا گیا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں خطاب پوری جماعت کو ہے' اس لیے جمع کے صیغہ کے ساتھ خطاب ہوا' اور دوسری آیت میں صرف اللہ کے رسول ﷺ سے خطاب ہے' اس لیے بصیغۂ مفرد خطاب ہوا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں خطاب اللہ کے رسول اور تمام اہلِ ایمان کو مجموعی طور پر کیا گیا ہے۔ اہل ایمان اس خطاب میں نبی ﷺ کے ساتھ شریک ہیں' جیسے سورۃ البقرۃ کے آخر میں بھی اسی طرح کا اجتماعی خطاب ہے۔ فرمایا:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ﴾ (آیت ۲۸۵)

''رسول اس چیز پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اُس پر اتاری گئی ہے اور اہل ایمان بھی۔''

پھر کہا: ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور اطاعت کی'' اور چونکہ حکم سب کو تھا تو گویا جو کچھ وحی کے ذریعہ اتارا گیا' وہ سب پر اتارا گیا تھا۔ حقیقی طور پر تو وحی صرف نبی ﷺ پر اتاری گئی تھی لیکن اس وحی کے تمام اہلِ ایمان تک پہنچنے کے تعلق سے وہ سب پر مجازاً اتاری گئی۔ اب چونکہ یہاں ''قُوْلُوْا'' کہہ کر سب کو حکم دیا گیا تھا اس لیے ''اِلَيْنَا'' کہنا زیادہ مناسب تھا۔

سورۃ العنکبوت (آیت ۴۶) میں جہاں خطاب سب سے تھا تو یہی ''اِلٰى'' کا صیغہ استعمال ہوا۔ فرمایا:

﴿وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ﴾

''اور کہہ دو! ہم ایمان لائے اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور جو تم پر اتارا گیا۔''

اس کے مقابلہ میں سورۂ آل عمران کی آیت میں خطاب صرف نبی ﷺ سے ہے' کہا گیا: ''قُلْ'' اور اس کی مناسبت سے ''عَلٰی'' کا صیغہ استعمال ہوا۔ اس لیے کہ اصلاً تو نبی ﷺ پر ہی قرآن کا نزول ہوا۔ اس لیے ''عَلٰی'' کا صیغہ اصالتاً نبیؐ کے لیے ہے اور مجازاً مؤمنوں کے لیے ہے۔

اضافہ از مترجم

صاحبِ ملاک التأویل کے کلام میں ابہام پایا جاتا ہے' لیکن اس مبحث کو ہمارے کویت کے دوست شیخ عدنان عبدالقادر نے اپنی کتاب ''الملاك لمعرفة عجائب وأسرار الآيات المتشابهة'' میں بہت عمدگی سے واضح کیا ہے۔ ہم یہاں ان کی ترجمانی کرتے ہیں:

(۱) ''اُنْزِلَ عَلٰی'' کا صیغہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جس پر وحی نازل ہو' اور اس سے مراد اعزاز اور تکریم کا اظہار بھی ہے' کیونکہ ''عَلٰی'' کا لفظ ''عُلُوٌّ'' یعنی بلندی سے آنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ شخص مذکور کے لیے اوپر سے نیچے تک برکت چاہتا ہے' اور یہ ایسے ہی ہے جیسے نہاتے وقت سر پر پانی ڈالا جائے جو سارے بدن کو چھوتا ہوا طہارت کا فائدہ دے' اور جیسے کسی مقابلے میں کامیاب شخص کو میڈل پہنایا جاتا ہے یا پھول پہنائے جاتے ہیں تو وہ سر سے گزار کر گردن تک پہنچتے ہیں۔

(۲) سورۂ آل عمران میں ''قُلْ'' کہہ کر رسول اللہ ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے: ''قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰه''۔ پھر کہا گیا: ''وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا..... الخ''۔ یہاں ''قُوْلُوْٓا'' کہہ کر مؤمنوں سے خطاب نہیں کیا گیا' اس لیے کہ جس پر وحی نازل کی گئی تھی وہی نزولِ قرآن کے اعزاز سے نوازا گیا تھا' تو یہاں ''عَلَيْنَا'' لاکر یہ بتایا جارہا ہے کہ گو مؤمنین بھی نزولِ قرآن پر خوشی کا اظہار کررہے ہیں' لیکن یہ قرآن اصلاً رسول اللہ ﷺ پر ہی نازل ہوا ہے کہ آیت کے شروع میں انہی سے خطاب ہے۔

اور پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ سورۂ آل عمران کا موضوع ''محمدؐ رسول اللہ'' ہے' اس لیے یہاں ''عَلٰی'' کا صیغہ لانا زیادہ مناسب تھا کہ محمد ﷺ ہی کو رسالت کا اور قرآن کے ان پر نازل ہونے کا شرف حاصل ہوا' اور جب یہ الفاظ ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ کہے گئے تو سب سے پہلے یہ الفاظ اللہ کے رسول ہی نے ادا کیے' اور چاہے یہاں جمع کا صیغہ ہی کیوں نہ ہو' سب سے پہلے اس صیغے سے وہی مراد ہوگا جو اصل مقصود ہے۔

(۳) جہاں تک صیغہ ''اِلٰی'' کا تعلق ہے تو وہ احکامات کی تعمیل کے لیے لایا جاتا ہے' مراد یہ ہے کہ یہ احکام ہم تک پہنچ گئے۔ جس طرح بادشاہ کا حکم جب رعیت تک پہنچ جائے تو ان پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے' اسی طرح کا معاملہ یہاں بھی ہے۔ یعنی وحی اصلاً مؤمنوں پر نہیں اتری' انبیاء پر اتری ہے' اور پھر ان کے ذریعے تمام اہلِ ایمان تک پہنچی ہے۔ اس لیے جب ''قُوْلُوْا'' کہہ کر اُمت سے خطاب کیا گیا تو یہاں ''عَلٰی'' کے بجائے ''اِلٰی'' کا صیغہ لانا زیادہ مناسب تھا' کیونکہ یہاں قول کی نسبت اُمتیوں کی طرف کی گئی ہے۔

(۴) سورۃ النساء کی آیت ۱۰۵ میں چونکہ تعمیل حکم مقصود تھا اس لیے وہاں نبی ﷺ کے لیے ''اِلٰی'' کا صیغہ لایا گیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ ؕ﴾

''ہم نے آپؐ پر حق کے ساتھ کتاب کو اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس چیز کے ساتھ فیصلہ کرسکیں جو اللہ نے آپ کو دکھائی ہے۔''

اور پھر آیت ۱۱۳ میں ''عَلٰی'' کا صیغہ لایا گیا' کیونکہ یہاں اعزاز وتکریم مقصود ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ وَرَحْمَتُہٗ لَھَمَّتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ اَنْ یُّضِلُّوْکَ ؕ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَضُرُّوْنَکَ مِنْ شَیْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ؕ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾﴾ (النساء)

''اور اگر آپؐ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ایک گروہ نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ آپ کو گمراہ کر دیں۔ حالانکہ اگر وہ گمراہ کریں گے تو صرف اپنے آپ کو کریں گے اور وہ آپ کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اللہ نے آپؐ پر کتاب اور حکمت کو اتارا' آپؐ کو وہ کچھ سکھایا جو آپؐ نہیں جانتے تھے' اور آپؐ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔''

ایک دفعہ پھر ہم اس بات کا اعادہ کیے دیتے ہیں کہ ''وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا'' کہہ کر اہل ایمان اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ ہم تک شریعت کے احکامات پہنچ گئے ہیں' تا کہ ہم ان پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور محبت کو پالیں اور یوں ہماری عبودیت پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ خیال رہے کہ یہ آیت سورۃ البقرۃ میں وارد ہوئی ہے جو عبودیت اور اللہ سے محبت کی سورت ہے۔

(۵) سورۂ آل عمران میں چونکہ خطاب اللہ کے رسول ﷺ سے ہے اس لیے وہاں استعلاء (عُلُو کا صیغہ) مناسب تھا اور سورۃ البقرۃ میں چونکہ تمام اہلِ ایمان مخاطب تھے اس لیے وہاں انتہاء (یعنی اِلٰی کا صیغہ) مناسب تھا۔ واللہ اعلم!

اب ہم اصل کتاب کی عبارت کی طرف لوٹتے ہیں۔

تیسرے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ سورۃ البقرۃ کی آیت میں ﴿وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ﴾ کہا گیا لیکن آل عمران کی آیت میں ''وَمَآ اُوْتِیَ'' ساقط کر دیا گیا اور وہ اس لیے کہ سورۃ البقرۃ میں چونکہ حکم نبی ﷺ کو اور اہل ایمان سب کو دیا گیا تھا تو اس لیے ''جو کچھ انبیاء کو دیا گیا'' کہہ کر ان کا خصوصی تذکرہ کیا گیا۔ صرف اس یاددہانی کے لیے کہ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کی طرح ان میں فرق روا نہیں رکھتے ہیں' تو ان کی اس کیفیت (یعنی سب پر ایمان لانے) کی مناسبت سے جہاں موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کے ساتھ ''وَمَآ اُوْتِیَ'' کے الفاظ لائے گئے وہاں تمام انبیاء کے لیے عمومی طور پر یہ الفاظ بھی لائے گئے۔

سورۂ آل عمران کی آیت میں خطاب کا آغاز لفظ قُلْ سے صرف نبی ﷺ سے ہو رہا ہے اور بعد میں عمومی تذکرہ ہوا ہے' اس لیے مناسب یہی تھا کہ دوسرے انبیاء کی طرف وحی کیے جانے کو علیحدہ سے بیان نہ کیا جاتا کہ رسول اللہ ﷺ کے مقام کا تقاضا ہے کہ وہ انبیاء میں فرق روا رکھنے سے بری ہیں۔

(۲۹) **آیت** ۱۴۴:

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ﴾

''ہم آپؐ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اب ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ خوش ہیں' تو آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔ اور آپ جہاں کہیں بھی ہوں' اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔''

اس کے بعد آیت ۱۴۹ اور ۱۵۰ میں دوبارہ یہ الفاظ آئے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾

''اور جہاں کہیں بھی تم نکلو تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔ اور یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اور اللہ غافل نہیں ان تمام اعمال سے جو تم کر رہے ہو۔''

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ﴾

''اور جہاں کہیں بھی تم نکلو تو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر دو۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اسی طرف اپنے چہرے پھیر دو۔''

سوال یہ ہے کہ ایک ہی بات کی بار بار تکرار کیوں ہو رہی ہے؟ کیا اس میں کوئی معنی پنہاں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے (واللہ اعلم) کہ جب کوئی اہم حکم دیا جاتا ہے تو اس میں اس کے تمام پہلوؤں کا اس لیے احاطہ کیا جاتا ہے تاکہ اسے بدرجہ کمال پورا کیا جا سکے اور اس میں کسی قسم کے شبہ کا احتمال نہ رہے' اور اس امت کے لیے خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے تاکہ یہ امت ان بوجھوں سے محفوظ رہے جن میں پچھلی امتیں گرفتار رہی تھیں۔

دیکھئے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا ہوا؟ جب انہیں مطلق حکم دیا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ﴾ (البقرۃ:۶۷)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔''

اب یہ حکم مطلق تھا اور دوسری طرف بنی اسرائیل کے حکم بجالانے میں سست روی بھی معروف تھی۔ انہوں نے حکم کی ماہیت جاننے کے لیے سوال در سوال شروع کر دیے' اور پھر جب ان کی طرف سے سختی کی گئی تو حکم بھی سخت ہوتا گیا' لیکن اس امت کو اس قسم کی سختیوں سے بچانا مقصود تھا۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرۃ:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر روزے ایسے ہی فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے والوں پر فرض کیے گئے تھے۔''

اور پھر روزے کی تفصیلات کھول کھول کر بیان کی گئیں۔ مہینہ کی حد بتائی گئی' مہینہ کا نام بتایا گیا' امساک کا آغاز اور افطار کا وقت بتایا گیا۔ حالتِ مرض اور حالتِ سفر کا بیان کیا گیا' روزوں کی گنتی پوری کرنے کا حکم واضح کیا

گیا۔یعنی وہ تمام باتیں بتائی گئیں جس سے یہ حکم علیٰ وجہ الکمال ادا کیا جا سکے‘ اور قبل اس سے کہ لوگوں کی طرف سے کوئی سوال ہو‘ تمام شبہات اور احتمالات کا پہلے سے جواب دے دیا گیا۔

بالکل ایسا ہی قبلے کی طرف رخ کرنے کے حکم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔اب یہاں سب سے پہلے تو نبی ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے:

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾

گو یہاں اس جہت کی وضاحت ہوگئی جس کی طرف رخ کرنا ہے‘ لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ یہ حکم آیا صرف نبی ﷺ کے لیے ہے یا آپ کی امت کے لیے بھی ہے؟ یہاں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ احتمال بعید ہے‘ کیونکہ خود نبی ﷺ سے ہی یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ایک شخص کو حکم دیا جانا‘ تمام لوگوں کو حکم دیے جانے کے برابر ہے اور یہ کہ نبی ﷺ سے خطاب نہ صرف ان کے لیے ہوتا ہے بلکہ تمام امت کے لیے بھی ہوتا ہے اِلا یہ کہ ایسی کوئی دلیل ہو جس سے وہ حکم صرف نبی ﷺ کے لیے خاص ہو جاتا ہو۔اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ ہم جس احتمال یا شبہ کے ہونے کی بات کر رہے ہیں‘ ان سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو کتاب وسنت کے مسلم قواعد کو جانتے اور پہچانتے ہیں‘ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو دل اور دماغ میں کج روی رکھتے ہیں‘ دین کے بارے میں نکتہ چینی کرنا ان کی عادتِ ثانیہ ہے‘ مسلمانوں کی نہیں بلکہ ملحدین کو مانتے ہیں۔ایسے ہی لوگ معمولی سے معمولی احتمال کو بھی نکتہ چینی کر کے پہاڑ بنا دیتے ہیں۔اس لیے نبی ﷺ کو حکم دیے جانے کے فوراً بعد امت کو بھی یہی حکم دیا گیا تا کہ یہ احتمال باقی نہ رہے کہ یہ حکم نبی ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔فرمایا:

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ﴾

یہاں ایک بات مزید نکھر کر سامنے آ گئی کہ اس حکم کا تعلق کسی خاص جگہ سے نہیں‘ بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو‘ اس قبلے کی طرف ہی رخ کرو۔ابھی بھی ایک احتمال باقی رہتا ہے جس کا تذکرہ مع الجواب ہم کرنے والے ہیں۔اور پھر فرمایا:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۹)

اب یہاں نبی ﷺ کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ حکم مدینہ میں بحالتِ اقامت اور مدینہ سے باہر جانے یعنی حالت سفر دونوں میں برابر ہے۔یہ بات چونکہ پہلی آیت سے واضح نہیں تھی اس لیے اسے علیحدہ سے واضح کیا گیا۔اور پھر اگلی آیت میں یہی بات دوبارہ دہرائی جا رہی ہے۔فرمایا:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ﴾

یہاں یقیناً تکرار ہے اور بعض دفعہ کسی بات کی تاکید کے لیے بھی تکرار کی جاتی ہے‘ اور اگر ان آیات کے پس منظر کو بھی یاد رکھا جائے کہ یہود نے تحویلِ قبلہ کے بارے میں بار بار اعتراض کیا تھا تو جواباً حکم میں بھی تکرار کی گئی۔لیکن یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دوسری آیت میں اُمت کو بھی واضح طور پر حکم دیا جا رہا ہے کہ تم بھی جہاں کہیں نکلو تو تمہارا بھی وہی حکم ہے جو نبی ﷺ کو دیا گیا ہے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ الفاظ ﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ﴾ بعینہٖ پہلے بھی آ چکے ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ پہلے مدینہ سے خروج کا تذکرہ نہ تھا۔ اس لیے ان دونوں آیات میں امت کے لیے بھی دونوں حالتوں کا حکم بیان ہوگیا۔ یعنی اگر مدینہ اور اس کے اطراف میں ہو تب بھی اور اگر مدینہ سے باہر نکل جاؤ تب بھی، حکم ایک ہی رہے گا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ بہرصورت مکرر واقع ہوئی ہے؟ جواب میں ہم کہیں گے کہ پہلی مرتبہ اس آیت کے بعد یہ الفاظ آ گئے:

﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾

یہ آیت فاصل بن گئی آیت کے پہلے جزو میں اور اس حکم میں جو اس کے بعد آ رہا تھا اور اسی پر اس کی بنیاد بھی تھی، اور قرآن کا یہ اسلوب ہے کہ اگر آیت کے جزوِ اوّل اور جزوِ ثانی میں گہرا ربط ہو اور بیچ میں فاصل آ جائے تو پھر پہلے جزو کی تکرار کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ المؤمنون کی آیت ۳۵ دیکھئے:

﴿اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾﴾

''کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈی میں تبدیل ہو جاؤ گے تو تم دوبارہ نکالے جاؤ گے؟''

یہاں لفظ ''اِنَّكُمْ'' کو دوبارہ لایا گیا کیونکہ ''اِنَّكُمْ'' کی خبر سے پہلے ﴿اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا﴾ کی وجہ سے فاصل آ گیا تھا۔ بعینہٖ اس آیت میں بھی ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ کو اگلے حکم سے جوڑنے کے لیے دوبارہ لایا گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ گو آیت کی تکرار ہوئی ہے لیکن اس سے مجرد تاکید مراد نہیں ہے بلکہ اس میں چند اضافی فائدے بھی پنہاں ہیں جو صرف تکرار سے حاصل ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے آیات کی تکرار مناسبت سے خالی نہیں۔

اور سورۂ قٓ کی آیات (۹ تا ۱۱) میں ارشاد فرمایا:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿۹﴾ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾﴾

''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی برسایا پھر اس سے اگائے باغات، کٹی جانے والی غلے کی فصلیں، بلند و بالا کھجور کے درخت تہ بہ تہ خوشے والے، بندوں کی روزی کے لیے، اور اسی (پانی) سے ہم زندہ کر دیتے ہیں مردہ زمین کو۔''

اور یوں سورۃ الجاثیہ میں واضح کر دیا کہ آسمان سے اُترنے والا پانی دراصل تمہارے لیے رزق مہیا کرتا ہے یا یہ کہ وہ رزق کا سبب بنتا ہے۔ اور اس طرح ''پانی سے کیا مراد ہے'' اس کی وضاحت ہوگئی، جیسے کہ سورۃ الذاریات (آیت ۲۲) میں بھی فرمایا:

﴿وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

''اور آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ تمام چیزیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

(جاری ہے)